مشرق و مغرب: تصورات، حدود اور امتیازات

East and West: Concepts, Boundaries and Distinctions

آسیہ نازلی [1]
پروفیسر ڈاکٹر قاضی عابد [2]

Abstract:

Usually, words from East and West are used for educational and literal purposes. But no one has precise division of these words used. Some people think to direction towards from where the sun rises it's taken to be East. Whereas, from where it sets is known to be West. Many other observe the division based on scholarly, intellectual, and traditional level. Many more observe the division on scientific basis, while still other many see it as a religious division. The boundaries of East and West are blur same as the confusions of intellectual division. We used to discuss these terms aimlessly without any clear intellectual dimension. This article is a trial to understand the thoughts, boundaries and differences of East and West.

Keywords: East, West, Europe, Colonialism, Clashes of Civilizations, Nazir Ahmad.

مشرق و مغرب کے مباحث نہ صرف اردو بلکہ مغربی دنیا میں بھی بہت اہم رہے ہیں۔ اکثر علمی و ادبی گفتگو میں مشرق اور مغرب کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ؛ مگر کسی کے ذہین میں ان کے حدود اربعہ اور امتیاز کی واضع تفریق نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اسے سمتوں سے جوڑتے ہیں اور جس طرف سے سورج طلوع ہوتا ہے ان ممالک کو مشرق اور جس سمت میں غروب ہوتا ہے اس طرف موجود ممالک کو مغرب میں شمار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ فکری اور تمدنی بنیاد پر یہ تفریق قائم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس تقسیم کی بنیاد مذہب کو بناتے ہیں اور کچھ لوگ سائنسی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کی فکری تقسیم میں موجود خلط مبحث کی طرح حدود اربعہ میں بھی ابہام موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ اصطلاحات کسی واضح فکری جہت کے بجائے بہت بے پرواہی کے ساتھ بولی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں مشرق اور مغرب کے تصورات، حدود اور امتیازات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: مشرق، مغرب، نوآبادیات، تہذیبی کشمکش، روایتی فکری زاویے

''مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے، یہ دونوں جڑواں بھائی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔''
یہ بات انگریزی کے مشہور شاعر اور ادیب رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی معروف نظم "The Ballad of East and West" میں ۱۸۸۹ء میں کہی تھی۔ اُس کے اصل الفاظ یوں تھے:

"Oh, East is East, and West is West, and never the twain shall meet."[1]

---

۱ لیکچرر (اردو)، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، قادر پور راں، ملتان
۲ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

یہ نہیں کہ پہلی بار مشرق اور مغرب کی تقسیم یا تفریق اُس کے ہاں دکھائی دی لیکن اُس کے اس مصرعے کی گونج بڑی دُور تک سنائی دی۔ گو یہ معلوم پھر بھی نہ ہو سکا کہ مشرق کی حد کہاں سے کہاں تک ہے اور مغرب کی حد کہاں سے کہاں تک۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہم اکثر اپنی علمی اور ادبی گفتگو میں مشرق اور مغرب کے الفاظ ادا کرتے ہیں مگر کسی کے ذہن میں ان کے حدود اربعے واضح نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں کیوں کہ مشرق یا مغرب کا تعلق کسی زمینی خطے یا حد بندی سے نہیں ہے۔ مزید بات کرنے سے پہلے ''فرہنگِ آصفیہ'' کے مؤلف مولوی سیّد احمد دہلوی سے استفادہ کرتے ہیں جنھوں نے لفظ ''مشرق'' کی تشریح کرتے وقت ایک انتہائی کام کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ ایشیا کا برّاعظم یورپ سے جانب شرق ہے اس وجہ سے انگریز لوگ اس کا اطلاق اُن تمام ممالک پر کرتے ہیں جو اُن سے جانبِ شرق یا ایشیا میں واقع ہیں۔''[۲]

اسی طرح ''جامع اللغات'' کے مؤلف خواجہ عبدالمجید، لفظ ''مشرقی'' کا ایک معنی ''ایشیا'' درج کرنے کے بعد اُس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

> ''چوں کہ ایشیا، یورپ سے مشرق کو ہے اس لیے یہ معنی ہوئے۔''[۳]

اور پھر ''مشرقی ممالک'' کے ذکر پر خواجہ عبدالمجید جب مزید وضاحت کرتے ہیں تو یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ:

> ''وہ ممالک جو یورپ کے مشرق میں ہیں۔ ایشیا کے ممالک۔''[۴]

اس سے پہلی بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ مشرق اور مغرب سورج کے نکلنے اور ڈوبنے سے متعلق الفاظ ہیں؛ یعنی دو سمتیں ہیں۔ جس طرف سے سورج طلوع ہو گا وہ مشرق اور جس طرف سورج غروب ہو گا وہ سمت مغرب کہلاتی ہے۔ اس کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل میں مشرق، ایشیا ہے اور مغرب، یورپ ہے۔ اور تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مشرق اور مغرب کا تعین یورپ نے کر رکھا ہے؛ یعنی اُن کے مشرق

میں جو ممالک ہیں یا جو خطۂ ارض ہے وہ مشرق کہلایا اور وہ خود مغربی کہلوائے گئے۔ اور اگر ایڈورڈ سعید کی زبان میں کہیں تو ''مشرق'' اور ''مغرب'' انسانوں کے تشکیل دیے گئے محض دو تصورات ہیں۔ وہ اپنی معروف کتاب ''شرق شناسی'' میں لکھتا ہے کہ:

> ''میں نے اس مفروضہ سے بات شروع کی تھی کہ 'مشرق' بہ طور ایک عنصرِ قدرت کوئی غیر متحرک چیز نہیں۔ یہ محض 'موجود' نہیں ہے جیسا کہ مغرب صرف 'موجود' نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں ویکو (Vico) کے عظیم نظریہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں اور وہ وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ اُنھوں نے بنایا ہے۔ اس نظریہ میں جغرافیہ کو بھی شامل کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہر وہ جغرافیائی اور تمدنی وجود جیسا کہ مقام، خطے، جغرافیائی علاقے جن کو ہم 'مشرق' یا 'مغرب' کہتے ہیں، انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے مغرب کی طرح مشرق بھی ایک تصور ہے جس کی اپنی ایک تاریخ، فکری روایت اور مناظر ہیں اور اس کا اپنا ذخیرۂ الفاظ ہے، جنھوں نے اسے اپنے اور مغرب کے لیے ایک وجودِ حقیقی بنا دیا ہے۔ یہ دونوں جغرافیائی وجود ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور کسی حد تک ایک دوسرے کی عکاسی کرتے ہیں۔''[۵]

اگرچہ بعد میں ایڈورڈ سعید نے یہ نتیجہ اخذ کر نا غلط قرار دیا کہ 'مشرق' محض ایک تصور ہے یا یہ ایک ایسی تخلیق ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں، اور پھر وہ طویل بحث کرتا ہے مگر مغربی مفکرین کے ہاں اسے ایک تصور سمجھا جاتا رہا، اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔

بہر حال ہم اس طرح یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اصل میں ایشیا ہی مشرق ہے اور مشرق اس لیے کہلاتا ہے کیوں کہ وہ یورپ کے مشرق میں ہے۔ اور جب یہ خطۂ ارض مشرق ہو گا تو یورپ خود بہ خود مغرب کے ذیل میں آجائے گا۔ لیکن بہر حال یہ مسئلے کا ایک رخ ہے کیوں کہ یہ مسئلہ اس قدر آسانی سے حل نہیں ہوتا۔

مشرق سے ایشیا بھی مراد لیا جاتا ہے، اسلام بھی اور چین و ہند بھی۔ مختلف جگہوں اور مواقعوں پر مختلف مفکرین مشرق کو اِن میں سے کسی کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ناؤم چومسکی جب اپنا ایک

انٹرویو ''مشرق و مغرب کی تہذیبیں'' کے عنوان سے دیتا ہے[٦] تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی نظر میں مغرب: فرانس، برطانیہ اور امریکہ کا متبادل ہے اور مشرق سے اُس کی مراد اسلام اور اسلامی ممالک ہیں۔ اس ذیل میں وہ اپنے پورے انٹرویو میں نہ چین اور جاپان کا نام لیتا ہے اور نہ ہندوستان کا۔ جب کہ ہمارے ہاں علامہ اقبال کے حوالے سے ناقدین و مفکرین مشرق کو اسلام کے متبادل کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں اور اُنھیں جب ''شاعرِ مشرق'' کہا جاتا ہے تو اس سے مراد مشرق کے مسلمانوں کا شاعر ہی لی جاتی ہے۔ ایک جگہ اقبال کے مشرق اور مغرب کے تصورات کے حوالے سے ہمارے ایک نقاد جب موازنہ پیش کرتے ہیں تو لفظ 'مشرق' کے ساتھ قوسین میں لفظ 'اسلام' درج کرتے ہیں، دیکھیے:

> ''اقبال کے نزدیک مغرب معین جغرافیائی حدود سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک رمز واشارہ اور علامت ہے، ایک ایسے معاشرے کا اطلاق ہے ایسی سوسائٹی پر جو ہر چیز کو عقل کے ترازو میں تولنے کا خواہاں ہے۔ ہر گتھی کو انسانی تدبیر کے سر پنجے سے سلجھانے کی آرزو مند ہے۔ جب کہ مشرق (اسلام) عرفانی دینی بصیرت، باطن، دل اور روشنی و صفا کی طرف توجہ کا مظہر ہے۔''[٧]

عالمی سطح کے ایک اور مفکر ایڈورڈ سعید بھی مشرق کو اسلام اور عرب کا اور مغرب کو فرانس، برطانیہ اور امریکا کا متبادل گردانتے ہیں۔ وہ اپنی معروف کتاب ''The Covering Islam'' کے 'تعارف' میں اس کتاب کا مقصد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ اس سلسلے کی تیسری اور آخری کتاب ہے جس کا مقصد آج کے جدید دور میں ایک طرف عالمِ اسلام، عربوں اور مشرق کو اور دوسری طرف مغرب یعنی فرانس، برطانیہ اور بالخصوص امریکا کو رکھ کر ان دونوں کے تعلقات کا جائزہ لینا تھا۔''[٨]

بات یہ ہے کہ ایڈورڈ سعید نے ''اسلامی مشرق''[٩] کی اصطلاح استعمال کر کے کم سے کم یہ احساس ضرور دلا دیا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق میں اسلام اور عربوں کے علاوہ بھی کچھ قومیں اور ممالک شامل ہیں۔ لیکن چوں کہ اُن کا بنیادی موضوع اسلام ہے اس لیے وہ مشرق کے صرف اُسی حصے کو اپنی بحث کا حصہ بنا رہے ہیں جو

اسلام یا اسلامی ممالک پر مبنی ہے۔ کیوں کہ یہ اندازہ ایڈورڈ سعید کو اچھی طرح تھا کہ مشرق صرف اور صرف اسلام یا اسلامی ممالک پر مشتمل خطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر باشعور مغربی یا مشرقی مفکرین جب مشرق کی بات کرتے ہیں تو اُس میں چین اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ جاپان کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ایوان پی۔ مک گریل کی مرتب کردہ تصنیف ''مشرق کے عظیم مفکر'' بھی ہے جس میں فارس، چین، ہندوستان اور دنیائے اسلام کے مفکرین کی فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔[۱۰] اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ فاضل مرتب کی نظر میں مشرق محض اسلام یا عرب دنیا تک محدود نہیں۔

اس کی ایک مثال ڈیوڈ لانڈیس کی بھی ہے جو مشرقی اقوام میں اسلامی، ہندوستانی، چینی اور جاپانی تہذیبوں اور اقوام کی بات کرتا ہے۔ اُس نے اپنی کتاب "The Wealth and Poverty of Nations" میں اس بات کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے کہ آخر کیوں مغربی تہذیب و تمدن دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں ترقی اور عروج حاصل کرتا چلا گیا۔ اور کس طرح مشرقی اقوام مغربی تہذیب کے مقابلے میں پیچھے رہ گئیں اور اُس کے زیرِ نگیں آگئیں۔[۱۱] اور اس ذیل میں وہ مشرقی تہذیبوں کو صرف اسلامی تہذیب تک محدود نہیں سمجھتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈیوڈ لانڈیس اُن مغربی مفکرین میں سے ہے جو مغربی تہذیب کی برتری کا قائل ہے اور اُس کے پاس اُس کے دلائل بھی ہیں۔ مشرقی اقوام یا تہذیبوں میں سے وہ صرف جاپانی تہذیب کو ترقی یافتہ ملک سمجھتا ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اُس میں ایک تو دوسروں سے سیکھنے کا جذبہ موجود ہے اور دوسرا جاپانی تہذیب نے جلد ہی یہ جان لیا تھا کہ تجارت اور مذہب کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔[۱۲] جب کہ اسلامی معاشروں کی ترقی میں مذہب کو وہ سب سے بڑی رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ اُس کے بقول:

> ''قرونِ وسطیٰ میں اسلامی معاشرہ میں سائنس اور علومِ عقلی کی ترقی و ترویج میں مذہبی دباؤ سب سے بڑی رکاوٹ تھی علماء کا کہنا تھا کہ مذہب نے سچائی اور حق کو دریافت کر لیا ہے اس لیے اب دوسرے علوم کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ ضرورت ہے کہ ان علوم کی مدد سے سچائی کو تلاش کیا جائے۔ اس مذہبی ماحول اور ذہنی تنگ نظری کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں مفکرین اور سائنس دانوں کے لیے تحقیق مشکل ہوگئی۔''[۱۳]

اس پر غور کریں تو لانڈیس کی یہ بات بڑی حد تک درست دکھائی دیتی ہے۔ ایک عجیب بات ضرور نظر آتی ہے کہ وہ چین کی تہذیب کو بھی پس ماندہ گردانتا ہے اور اُس کی نظر میں اس کی وجہ یہ ہے کہ چینیوں میں تجسّس کی کمی اور خود نمائی کا عنصر زیادہ ہے جس کی بِنا پر وہ دوسروں سے سیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں اُن میں نہ تبدیلی کی کوئی خواہش ہے اور نہ وہ جارحانہ جذبات اور مقاصد رکھتے ہیں [۱۴] اور ان عناصر کے بغیر ترقی محال ہے۔ جب کہ برطانوی مؤرخ ٹوائن بی چین کی تہذیب و معاشرت کو سراہتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے:

> ''جدید دنیا کے تجربے سے یہ معلوم ہُوا ہے کہ چینی ہر طرح کے کاروبار میں انتہائی لائق ہیں اور خاندانی زندگی کا اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ چینیوں نے اپنی ان خوبیوں کا اس زمانے میں بھی مسلسل اظہار کیا جب ان کا ملک انتشار کا شکار تھا۔ لیکن انتشار چین کی عام حالت نہیں ہے۔''[۱۵]

مشرق اور مغرب کے مفہوم کا ایک تناظر نوآبادیاتی مطالعہ بھی ہے۔ اس سے جو کچھ مراد لیا جاتا ہے اُس پر تفصیلی روشنی تو ایڈورڈ سعید نے اپنی مختلف تصانیف میں ڈالی ہے مگر اب سب اس پر متفق ہیں اور ہمارے ہاں اس کا زیادہ ذکر ڈاکٹر مبارک علی کے ہاں ملتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''مشرق اور مغرب'' میں لکھتے ہیں:

> ''نوآبادیاتی نظام اور سامراج کے علم برداروں کے نزدیک مشرق پس ماندہ، جہالت میں گھرا ہوا، توہمات میں جکڑا ہوا، پس ماندہ خطہ تھا کہ جس کے لوگ سست و کاہل اور عقل و خرد سے دُور تھے، جب کہ ان کے مقابلہ میں اہلِ مغرب صاحبِ علم و فراست، تیز و تند، چست و چالاک اور مہم جو تھے اور یہ اس لیے تھا کیوں کہ مغربی تہذیب کے اہم عناصر میں سائنسی سوچ، عقلیت اور جستجو و تحقیق و تفتیش رچی بسی ہوئی تھی۔''[۱۶]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کلامیے کو فروغ دینے میں نوآبادیاتی قوتوں کا ہاتھ ہے کہ مشرق یعنی ایشیا پس ماندہ اور جہالت کا مارا ہوا ہے جب کہ مغرب ترقی یافتہ ہی نہیں تعلیم یافتہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب چین، جاپان، ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے مؤرخ اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کی نئے سرے سے تشکیل کر رہے ہیں جس کی وجہ سے بقول ڈاکٹر مبارک علی:

> ''مشرق کا روایتی نظریہ کہ یہ ہمیشہ سے پس ماندہ رہا ہے، اس کا عالمی تہذیب و تمدن میں کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ یہ مفروضے آہستہ آہستہ ردّ ہو رہے ہیں۔ اب تک مغرب کا تاریخ میں جو مرکزی مقام تھا وہ کم زور ہو رہا ہے اور تاریخ کو مغربی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے علاقائی اور عالمی نقطہ ہائے نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔'' [۱۷]

لیکن بہر حال مغربی مفکرین اور سیاسی مبصرین اس بات کو اس قدر آسانی سے ماننے کو تیار نہیں کہ عالمی تہذیب میں مشرق یا ایشیائی اقوام کا بھی کوئی خاطر خواہ حصہ ہے۔ جیسا کہ ہم ڈیوڈ لانڈیس کے ہاں دیکھ بھی آئے ہیں۔ وہ اب بھی تاریخ کو یورپ مرکزیت کا حامل بتاتے ہیں اور اسی کو ثابت کرنے کی کوشش میں سر گرداں ہیں۔ اور اگر ایشیا یا مشرق کو کوئی اہمیت دیتے بھی ہیں تو مشرقی ایشیا کو جو جاپان اور چین پر مبنی ہے۔

اس سلسلے میں جاپانی مفکر دائیسا کو اکیدا اور برطانوی مورّخ آرنلڈ ٹوائن بی کا مکالمہ بہت دلچسپ ہے۔ جس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپی مفکرین ایشیا کے بارے میں کس طرح کا تجزیہ کرتے ہیں اور دوسرا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دو حصوں میں بٹا ہُوا ہے۔ جاپانی مفکر دائیسا کو اکیدا یہ بات کسی بحث کے بغیر تسلیم کر لیتا ہے کہ ایشیا، مغربی اقوام سے ہر حوالے سے پیچھے ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے:

> ''ایشیا کے ایک بڑے حصے کو فاقہ کشی کا خطرہ لاحق ہے۔ بد قسمتی سے مکمل پیمانہ پر صنعتوں کا قیام ایشیا کے لیے ابھی بہت آگے مستقبل کا معاملہ ہے۔ علم و ثقافت کے میدان میں بھی ایشیا، مغربی اقوام سے پیچھے ہے۔'' [۱۸]

اگرچہ یہاں اکیدا لازماً اپنے جاپان کو شامل کر کے یہ بات نہیں کر رہا۔ صاف پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جس ایشیا کی بات کر رہا ہے وہ مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان پر مبنی ایشیا ہے۔ لیکن جواب میں ٹوائن بی پوری وضاحت کرتا ہے اور جاپان اور چین کو مشرقی ایشیا اور ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کو مغربی ایشیا قرار دے کر تجزیہ کرتا ہے جو ہمارے ناقدین اور مفکرین کو ضرور جاننا چاہیے کہ محض نوآبادیاتی قوتوں کے سر سارے الزام دھر کر ہر عمل سے مبرّا نہیں ہُوا جا سکتا اور حال کی سچی تصویر کا سامنا کرنے کی ہمت ضرور کرنی چاہیے۔ وہ اکیدا کو جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

> ''مجھے توقع ہے کہ مشرقی ایشیا انسانی تہذیب کے فروغ اور امن کے قیام میں ایک بڑا مثبت کردار ادا کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ باقی ایشیا (برصغیر ہند و پاک اور مشرق وسطیٰ) عالمی برادری کے استحکام میں کوئی قابلِ ذکر مثبت کردار ادا کر سکے گا جو عالمی تباہی کا واحد متبادل ہو۔ ہندوستان، پاکستان اور مشرق وسطیٰ پٹرولیم کے اپنے بڑے ذخائر کے باوجود معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ یہ خطے سیاسی اعتبار سے انتشار کا شکار ہیں۔ ہندو مسلم، عرب اسرائیل، پاکستان اور بنگلا دیش، رجعت پسند اور ترقی پسند عرب ریاستوں کی محاذ آرائی۔۔۔ مغربی ایشیا کے لوگ انسانیت کے مسائل حل کرنے میں مددگار نہیں ہوں گے۔ ان کے اپنے ہی علاقائی مسائل رہیں گے جن کے حل کے لیے دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔''[۱۹]

اس میں شک نہیں کہ ترقی کے نشے میں سرشار مغربی موَرخین جب مشرق پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو ہر طرف جہالت اور کاہلی کے ساتھ ساتھ جمود ہی جمود نظر آتا ہے۔ وہ یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ مشرق کی تہذیبیں بہت قدیم اور پرانی ہیں، اس حوالے سے وہ کسی قدر مشرق کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اُن کا کہنا ہے کہ یہ بھی سچ ہے کہ یہ تہذیبیں ہزاروں برس سے ایک ہی ڈگر پر چلی آرہی ہیں۔ ان میں گوتم بدھ کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ مثلاً جان سٹیورٹ مل کے باپ جیمز مل نے جو ہندوستان میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہا تھا، اپنی کتاب ''برطانوی ہند کی تاریخ'' (۱۸۱۸ء) میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ :

> ''ہندوستانیوں کے طور طریقے، ان کی سوسائٹی اور معلومات چوتھی صدی قبل مسیح میں بھی وہی تھیں جو انگریزوں کے وارد ہونے کے وقت تھیں۔''[۲۰]

اور اس کے لیے جیمز مل نے سکندر اعظم کے ہم سفر موَرخین کی عینی شہادتیں بھی پیش کر دی تھیں۔ علاوہ ازیں ہیگل نے جیمز مل کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے، لہٰذا ان کے حالات سکندر کے ہم سفر مصنفوں ہی سے پتہ چلتے ہیں۔''[۲۱] ہیگل نے چین کو بھی اس زمرے میں شامل کر

لیا اور لکھا کہ 'چین کی طرح ہندوستان بھی ایک ہی جگہ پر قائم اور جامد رہا ہے۔''[۲۲] ان مفکروں کے خیال میں اصل میں سماجی جمود فقط چین یا ہندوستان کا مقدر نہ تھا بلکہ پورا مشرق اس مہلک مرض میں مبتلا ہے۔

سماجی اور فکری جمود کے علاوہ ان مفکرین کے ہاں مشرقی ریاستوں کے استبدادی کردار کا بھی نہایت شہرہ ہے۔ ایڈم سمتھ سے لے کر مالتھس تک اور ہابس سے لے کر ہیگل تک ہر مفکر ''مشرقی استبدادیت'' (Oriental Despotism) کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا ہے [۲۳] اور اس کا موازنہ مغرب کی 'روشن خیال' استبدادیت سے کرتا تھا اور فریڈرک اعظم، پیٹر اعظم، ملکہ کیتھرین اور لوئی چہار دہم کی مثالیں پیش کرتا تھا۔ اہلِ مغرب کو یہ تاثر قدیم یونانی موَرخوں سے ورثے میں ملا تھا اور یہ نتیجہ تھا پانچویں صدی قبل مسیح میں لڑی گئی یونان اور ایران کی جنگوں کا [۲۴] جن کی بنا پر ایرانی سلطنت مغرب کی نظر میں ہمیشہ کے لیے مشرقی استبدادیت کی علامت بن گئی۔ چناں چہ ہیگل اپنی کتاب (Philosophy of History) میں مشرق پر لعن طعن کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: (یہاں ہندوستانی مشرق کا اہنسا، امن کا فلسفہ زیرِ بحث آنا چاہیے کہ حملہ آوری انسانیت کے لیے بہتر ہے یا امن وآشتی)

> ''ہندوستان میں انتہا درجے کی من مانی، بداعمال اور ذلت آمیز استبدادیت کا راج ہے۔ چین، ایران، ترکی در حقیقت پورا ایشیا استبدادیت اور بری قسم کی جابریت کا منظر پیش کرتا ہے۔''[۲۵]

یہی وجہ ہے کہ اپنے لیکچروں میں تاریخ کے ارتقائی مدارج کا تعین کرتے ہوئے ہیگل مشرقی ریاستوں کو سب سے نچلی سطح پر رکھتا ہے کیوں کہ ان ریاستوں میں فقط ایک شخص آزاد تھا اور وہ تھا مطلق العنان بادشاہ۔ اس سے اوپر یونان اور روما کی قدیم ریاستیں تھیں جن میں 'چند افراد' آزاد تھے اور سب سے اعلیٰ سطح پر جرمن ریاست تھی جو انسان کی 'آزادیٔ مطلق' کا نقطۂ عروج تھی۔[۲۶] ہیگل کے اس تصور کو ہمارے ہاں سبطِ حسن نے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے اُسی کی طرح اُس کے لیے بھی سخت الفاظ استعمال کیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ نام نہاد جرمن ریاست ہیگل کے تخیل کی تخلیق تھی۔ ورنہ حقیقت میں انیسویں صدی میں جرمن ریاست اتنی ہی مستبد اور مطلق العنان تھی جتنی قرون وسطیٰ کی مشرقی ریاستیں۔ جرمن ریاست کی اسی بے جا مدح سرائی کی بدولت ہیگل کو سرکاری فلسفی کا مرتبہ ملا اور ہٹلر نے بھی اسے بانس پہ چڑھایا۔''[۲۷]

سبطِ حسن کے اس تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی مفکرین اور مؤرخین کی مشرق اور مشرقی اقدار اور تہذیبوں کے بارے میں ہر بات حرفِ آخر کا درجہ نہیں رکھتی اور اسی طرح مغربی تہذیب کے بارے میں بھی اُن کا ہر خیال حقیقت پر مبنی ہو نا ضروری نہیں۔

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب ہمیں ایک مشرقی فاتح بھی ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور اقدار کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ظہیرالدین بابر کی مشہور سوانح ''تزکِ بابری'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو اس ضمن میں انتہائی غور طلب ہے۔ ہندوستان سے متعلق ظہیرالدین بابر کے خیالات دیکھیے، وہ لکھتا ہے:

''ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں تفریحات بہت کم ہیں۔ یہاں کے باشندے بھی قبول صورت نہیں ہیں۔ انھیں دوستانہ مجلسوں اور بے تکلفانہ صحبتوں یا مخلصانہ ربط و ضبط کے لطف کا کوئی اندازہ نہیں، یہ ذہنی صلاحیتوں سے عاری ہیں۔ روحانی کیفیتوں سے ناواقف ہیں اور شائستہ آداب یا مہربانی و ہم دردی کے احساسات سے معرا ہیں۔ یہ اپنی دست کاری کی تخلیقات کے متعلق کوئی نیا منصوبہ نہیں سوچ سکتے نہ کوئی نئی ایجاد کر سکتے ہیں۔ انھیں تعمیرات کے کام میں بھی مہارت حاصل ہے نہ علم۔ نہ یہاں گھر اچھے ہیں نہ یہاں گوشت عمدہ ملتا ہے۔ ان کے بازاروں میں نہ اچھی غذا ہے نہ روٹی، نہ حمام ہیں نہ کالج، نہ شمعیں، نہ مشعلیں، نہ کوئی شمع دان۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں نہیں ہوتیں۔ عوام ننگے پاؤں پھرتے ہیں، ناف سے دو مٹھی نیچے ایک کپڑا باندھتے ہیں اس کو لنگوٹا کہتے ہیں جب لنگوٹا باندھتے ہیں تو کونے کو دونوں رانوں کے بیچ میں سے لے کر پیچھے اڑس لیتے ہیں۔''[۲۸]

مغرب کے حوالے سے ہم فی الوقت یہ مان چکے ہیں کہ اس سے مراد یورپ ہے مگر یہ بھی اس قدر آسان مسئلہ نہیں۔ ایک معروف مفکر اسٹوارٹ ہال نے اس ضمن میں نہ صرف اُن پیچیدگیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کا سامنا ''مغرب'' یا ''مغربی'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ہر سوچنے والے فرد کو ہوتا ہے بلکہ اس ذیل میں بہت اہم نقاط بھی اُٹھائے ہیں اور ایک دلچسپ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے۔ اُس کا بنیادی موٗقف یہ ہے کہ ''مغرب'' اب ''جدید'' کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کیا ہے اُس کے لیے اُس کی اُس دلچسپ بحث سے آگاہ ہونا از بس ضروری ہے جو اُس نے اس ذیل میں کی ہے۔ اقتباس اگرچہ کچھ طویل ہے مگر ہال کے نقطۂ نظر سے واقف ہونے کے لیے ناگزیر ہے، لٰہذا آیئے دیکھتے ہیں وہ کیا کہتا ہے، وہ لکھتا ہے:

> ''ہم عمومی طور پر مغرب اور مغربی کی اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں، لیکن در حقیقت ان کے پس منظر میں بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ پہلی نظر میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات کے ذریعے جغرافیائی مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لیکن اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے ہم ایک خاص قسم کے معاشرے کی بات کرتے ہیں کہ جو منفرد انداز میں ترقی یافتہ ہو رہا ہے۔ لیکن ہم جس ترقی یافتہ مغربی معاشرے کی بات کرتے ہیں، وہ اوّل مغربی یورپ میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو مغرب صرف یورپ ہی میں نہیں ہے، اور نہ ہی تمام یورپ، مغرب ہے۔۔۔ مشرقی یورپ کبھی بھی مغرب نہیں کہلایا۔ لیکن امریکا جو کہ یورپ میں نہیں ہے وہ مغربی کہلاتا ہے۔ ٹکنالوجی کے اعتبار سے جاپان مغرب ہو گیا ہے، اگرچہ جغرافیائی طور پر وہ مشرق کے دور دراز کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کے مقابلے میں لاطینی امریکی ممالک جو مغربی ہی سفیر یا علاقے میں واقع ہیں، معاشی طور پر تیسری دنیا میں شامل ہیں، اور مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ وہ مغرب میں شامل ہو جائیں۔۔۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مغرب محض جغرافیائی نہیں، بلکہ ایک تاریخی تشکیل ہے۔ مغرب سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو کہ ترقی یافتہ، صنعتی، شہری، سرمایہ دارانہ، سیکولر اور جدید ہو۔۔۔ اس کی تشکیل میں خاص قسم کے معاشی، سیاسی اور ثقافتی عوامل کا دخل رہا ہے۔ موجودہ دور میں کوئی بھی معاشرہ کہ جو ان

خصوصیات کا حامل ہو، چاہے جغرافیائی طور پر وہ کہیں واقع ہو، اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق مغرب سے ہے۔ اس لحاظ سے مغرب کے معنی اب ''جدید'' کے ہو گئے ہیں۔''[۲۹]

اسٹوارٹ ہال کے اس تجزیے سے صرفِ نظر کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بات ہم پہلے بھی کسی حد تک جان چکے تھے کہ مغرب اصل میں کسی جغرافیے کا نام نہیں لیکن پھر یہ کیا ہے اس کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہال کے اس تجزیے سے ایک جواب ضرور سامنے آتا ہے کہ اصل میں مغرب ایک تاریخی تشکیل ہے جس کا تعلق اس تصور سے ہے کہ معاشرہ کس قدر معاشی طور پر ترقی یافتہ، صنعتی، سیکولر اور لبرل جمہوریت پر مبنی ہے۔ اور اس کے لیے وہ جو دلائل ہمارے سامنے رکھتا ہے وہ واقعی جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ واقعی ہم امریکا کو جو یورپ میں شامل نہیں ہم اُسے مغرب میں شمار کرتے ہیں اور لاطینی امریکی بہت سے معاشرے جو مغربی علاقے میں ہیں، حتیٰ کہ مشرقی یورپ کو بھی مغرب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ جب کہ یہ بات بھی کافی حد تک درست ہے کہ جاپان کے بارے میں بھی جو سراسر ایک ایشیائی ملک ہے، اُس کی ٹیکنالوجی اور جدیدیت کی بنیاد پر اکثر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ جیسے وہ بھی مغرب ہے۔

اب ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ مغرب کا تصور ایک تاریخی تشکیل ہے، تو یہ تشکیل کیسے ممکن ہوئی۔ اس پر جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے مشرق کے تصور کا ہاتھ ہے۔ ایک بات اب ہم سب جان چکے ہیں کہ کسی اصطلاح یا لفظ کی اہمیت اور اُس کے معنوں کا تعین اُسی صورت میں زیادہ بہتر انداز سے ہوتا ہے جب اُس کا مقابل کوئی دوسری متضاد اصطلاح یا لفظ ہو۔ معروف لسانیاتی اور ساختیاتی مفکر فرڈینینڈ سوسیئر نے بتایا کہ دن اور رات خود اپنے طور پر بامعنی نہیں ہیں، یہ تو اِن دونوں کے درمیان کا فرق ہے جو انھیں بامعنی بناتا ہے۔ اسی طرح ماہرین نفسیات کے بقول ایک بچہ اپنا شعور دوسروں سے مقابلہ کر کے اور خود کو اُس سے الگ تصور کر کے حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح قومی تشخص کا تعین بھی دیگر متضاد

ثقافتوں سے تقابل سے ہی متعین ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ذیل میں بھی اسٹوارٹ ہال کی تشریح قابلِ قبول ہے، وہ لکھتا ہے:

''دیکھا جائے تو مغرب اور بقایا دنیا ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے تعلق اور رابطہ کے بغیر ایک دوسرے کو سمجھنا ناممکن ہے۔ مغرب کے منفرد ہونے کا تصور اس وقت پیدا ہوا کہ جب یورپ کا تعلق غیر یورپی معاشروں سے ہوا، اور اس نے خود کا ان سے مقابلہ کیا تو اسے ان کی تاریخ، جیولوجی، ترقی کے مختلف طریقے اور نظام، اور ثقافتوں میں فرق نظر آیا۔ غیر مغربی اور مغربی معاشروں کا یہ فرق تھا کہ جس کی روشنی میں مغرب نے اپنے کارناموں کا جائزہ لیا اور اس تعلق و رشتہ کی وجہ سے 'مغرب' کے تصور کی تشکیل ہوئی۔ مشرق اور مغرب کے درمیان پہلے سے قائم کیے خیالات کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ اس فرق کو سمجھا جائے کہ جو دونوں کو علیحدہ کرتا ہے۔''[۳۰]

اب اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں تو مشرق؛ ایشیا ہے، اسلامی دنیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر مبنی خطہ ہے، غیر ترقی یافتہ، پس ماندہ، غیر جمہوری، مذہبی اور روایتی قسم کے معاشروں کا مجموعہ ہے، تیسری دنیا ہے، ہندوستان اور پاکستان ہے۔ جب کہ مغرب؛ برطانیہ، فرانس اور امریکا جیسے ترقی یافتہ ممالک کا مجموعہ، جہاں لبرل ازم، سیکولرازم اور کیپیٹل ازم کا دور دورہ ہے، صنعتی اور سائنسی ترقی عروج پر اور جدیدیت کی راہیں ہموار ہیں۔

حوالہ جات

1. Rudyard Kipling, The Ballad of East and West, (1889), www.poetryloverspage.com, dated: 05-04-2019.

۲۔ احمد دہلوی، سیّد، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد چہارم) (لاہور: الفیصل، جون ۲۰۱۷ء)، ص ۲۹۰۵۔

۳۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد دوم) (لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۸۳۴۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۸۳۴۔

۵۔ سعید، ایڈورڈ، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۔

۶۔ نوم چومسکی، گیارہ ستمبر، مترجم: سیّد کاشف رضا (کراچی: شہر زاد، جنوری ۲۰۰۴ء)، ص ۱۱۳: ۹۱۔

۷۔ بحوالہ: ڈاکٹر محمد آصف، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کش مکش (ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۸۳: ۱۸۴۔

۸۔ سعید، ایڈورڈ، اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ، مترجم: ظہیر جاوید (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۱۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ایوان پی۔ مک گریل (مرتب)، مشرق کے عظیم مفکر، مترجم: یاسر جواد (لاہور: تخلیقات، جنوری ۱۹۹۷ء)۔

۱۱ Landes, D.S, <u>The Wealth and Poverty of Nations</u> (London: Little Brown and Company, 1997), P:67.

۱۲ Ibid, P:137.

۱۳۔ بحوالہ: مبارک علی، ڈاکٹر، یورپ کا عروج (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۸۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔

۱۵۔ ٹائن بی، آرنلڈ اور اکیدا، دائیساکو، انتخابِ زندگی۔ ایک مطالعہ (مکالمہ)، مترجم: ڈاکٹر منظور احمد (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۴۵۔

۱۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور تحقیق (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۶۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۹۔

۱۸۔ ٹائن بی، آرنلڈ اور اکیدا، دائیساکو، انتخابِ زندگی۔ ایک مطالعہ (مکالمہ)، مترجم: ڈاکٹر منظور احمد، ص ۲۴۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔

۲۰۔ بحوالہ: سبطِ حسن، مارکس اور مشرق، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سید جعفر احمد (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۸۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۸: ۳۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۲۸۔ بحوالہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''کلچر کیا ہے؟''، مشمولہ: کلچر، مرتبہ: اشتیاق احمد (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۷: ۸۸۔

۲۹۔ اسٹوارٹ ہال، ''مغرب اور بقیہ دنیا''، مشمولہ: جدید تاریخ، مؤلف: ڈاکٹر مبارک علی (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۱۷: ۲۱۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔